مجھے خلافت کا فریضہ اس لئے سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔

اللہ اکبر! کتنی بلند حقیقت کو کیسے سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ قیام خلافت کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے۔ جب کیفیت یہ ہوگی تو پھر کسی شخص کو اپنی ضروریات کے لئے خدا سے دعا کرنے کی حاجت ہی نہیں رہیگی۔ اور اگر کوئی شخص، اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے دعا کرتا پایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر رہا ہوں اور وہ شخص میرے خلاف گویا خدا سے شکایت کر رہا ہے۔ اس لئے مجھے فوراً احتساب خویش کرنا ہوگا اور اس امر کی کوشش کہ میری شکایت بارگاہِ خداوندی تک نہ پہنچنے پائے۔ ضرورت مند کی ضرورت اس سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔

یہ ہوتی ہے اس معاشرہ کی کیفیت جو وحی کی راہ نمائی میں متشکل ہوتا ہے۔ اس میں کسی کو اپنی انفرادی ضروریات کے لئے خدا سے کچھ مانگنا ہی نہیں پڑتا۔ جسے سب کچھ از خود مل رہا ہو، اسے مانگنے کی کیا ضرورت ہوگی! یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں مومنین کی جس قدر دعائیں مذکور ہیں سب اجتماعی ہیں انفرادی نہیں۔ یہ اجتماعی دعائیں کس مقصد کے لئے کی جاتی ہیں، اس کا اندازہ خود ان دعاؤں سے لگ سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے مومنین کی چند ایک دعائیں۔

مومنین کی سب دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں

(۱) اے ربّ العالمین! ہمیں زندگی کی سیدھی اور ہموار راہ دکھا دے۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تیرے سحابِ کرم کی بارش ہوئی تھی۔ (۱/۷-۵)

(۲) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس دنیا میں بھی حسنات عطا فرما اور آخرت میں بھی حسنات۔ (۲/۲۰۱)

(۳) مجاہدین کی دعائیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ثبات و استقامت عطا فرما تاکہ ہمارے قدموں میں لغزش نہ آنے پائے۔ اگر ہم سے کہیں بھول چوک ہو جائے تو اس کے نقصان سے ہماری حفاظت فرما دے اور ہمیں مخالفین پر کامیابی عطا فرما۔ (۲/۲۵۰؛ ۱۴۷-۳/۱۴۶)

(۴) اے ہمارے پروردگار! ہمارے سہو و نسیان سے درگزر فرما۔ ہم جہالت اور غفلت کے اُس

زندگی نہیں انسانیت کی زندگی بھی ہے۔ فرائض کا احساس، لغزش پر ندامت، مستقبل پر نگاہ، یہ سب انسانی زندگی کے مظاہر ہیں۔ بنیادی طور پر سمجھا جائے تو انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں بلکہ (جیسا کہ سابقہ ابواب میں بتایا جا چکا ہے) جسم کے علاوہ

انسانی ذات کی نشوونما

اس کے پاس ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ جس طرح جسم کی پرورش اس کی حیوانی زندگی کا تقاضا ہے اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما اس کی انسانی زندگی کا تقاضا ہے۔ اس کے لئے انسان کو فطرت کی طرف سے کوئی راہ نمائی نہیں ملتی۔ بالفاظ دیگر خیر اور شر کی تمیز انسان کے اندر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "انسان شر کو بھی اسی طرح پکار پکار کر بلاتا ہے جس طرح خیر کو۔ یہ بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے" (۱۷/۱۱)۔ یہ پیش پا افتادہ مفاد کی طرف لپک کر جاتا ہے، خواہ وہ آخر الامر اس کے حق میں کتنے ہی نقصان رساں کیوں نہ ثابت ہوں۔

ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال چلا آ رہا ہے کہ نیکی اور بدی کی تمیز انسان کو فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ اس خیال کی تائید میں قرآن کریم کی ایک آیت بھی پیش کی جاتی ہے۔ یعنی وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا...... وَدَسّٰهَا (۹۱/۷-۱۰)۔ اس آیت (فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا) کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا نے انسانی نفس کو نیکی اور بدی کا الہام کر دیا ہے۔ لیکن نہ صرف

نیکی اور بدی کی تمیز انسان کے اندر نہیں

یہ کہ اس آیت کا ترجمہ صحیح نہیں، یہ پورے کا پورا تصور ہی قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ سب سے پہلے تو اس لئے کہ اگر نیکی اور بدی کی تمیز ہر فرد کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے تو حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے رشد و ہدایت کا سلسلہ بے معنی قرار پا جاتا ہے۔ اس قسم کی تمیز دیگر اشیائے کائنات میں (مثلاً حیوانات میں) تو رکھ دی گئی ہے۔ اس لئے ان کی طرف کسی نبی کے بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پھر یہ کہ یہ تمیز ہمارے تجربہ اور مشاہدہ کے بھی خلاف ہے۔ انسانی بچہ جس قسم کے ماحول میں پرورش اور تربیت پاتا ہے اسی قسم کے خیالات و معتقدات لے کر پروان چڑھتا ہے۔ جینی بچے کے نزدیک گوشت نہایت قابل نفرت شے ہے لیکن مسلمان بچہ گوشت مزے لے لے کر کھاتا ہے۔ لہٰذا یہ تصور غلط ہے کہ نیک و بد کی تمیز اور خیر و شر کی تفریق انسان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ سورۂ والشمس کی جو آیات اوپر درج کی گئی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ نفس انسانی (انسانی ذات) میں یہ امکانی صلاحیت و استعداد رکھ دی گئی ہے کہ وہ چاہے تو اپنے آپ کو محفوظ رکھ لے اور چاہے اپنی تخریب کر لے۔ جو فرد اس کی نشوونما کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔ جو اسے دبائے رکھے گا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ دراصل ان آیات میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ انسانی ذات نشوونما اور ارتقا یافتہ شکل میں نہیں دی گئی۔ وہ صرف امکانی صلاحیتوں (POTENTIALITIES) کا مجموعہ ہے۔ اگر انسان ان صلاحیتوں کی صحیح پرورش کر لے تو انسانی ذات نشوونما یافتہ

اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللّٰہِ الاِسلَام

"انسان نے کیا سوچا؟" کا دوسرا حصّہ

خُدا نے کیا کہا؟

یعنی

اسلام کیا ہے؟

جو خدا کی طرف سے نوعِ انسان کے لئے بطور نظامِ زندگی عطا ہوا تھا
اور جس سے کاروانِ انسانیت نے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا تھا

پرویز

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

انسان کی فطرت کوئی نہیں

"انسان کی کوئی فطرت نہیں" ایک عظیم انقلابی اعلان ہے جو اس خیال کے یکسر خلاف جاتا ہے جو دنیا میں بطور مسلّمہ مانا جاتا ہے۔ "انسانی فطرت" ایک ایسی اصطلاح ہے جو صدیوں سے انسان کے کان میں پڑتی چلی آرہی ہے اور اس طرح اس نے ایک حقیقتِ ثابتہ کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ لیکن اصل یہی ہے کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ فطرت، کسی شے کی ان بنیادی خصوصیات کو کہا جاتا ہے جو پیدائش سے اس کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہوں اور جن کے مطابق وہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔ پانی کی فطرت ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے۔ آگ کی فطرت ہے کہ وہ حرارت پہنچائے۔ بکری کی فطرت ہے کہ وہ گھاس کھائے شیر کی فطرت ہے کہ وہ گوشت کھائے، گھاس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ یہ تمام اشیائے کائنات اور حیوانات اپنی اپنی فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ اپنی فطرت بدل نہیں سکتے۔ فطرت ہوتی ہی غیر متبدل ہے۔ جہاں تک انسان کی حیوانی سطح کی زندگی (یعنی طبیعی زندگی) کا تعلق ہے، اس پر قوانینِ فطرت اسی طرح حاوی ہیں جس طرح دیگر حیوانات پر۔ لیکن اس کی انسانی سطح کی زندگی میں کوئی شے ایسی نہیں جسے اس کی فطرت کہا جائے۔ "انسانی" فطرت کے متعلق یہی غلط تصور تھا جس سے ایک گروہ نے یہ کہہ دیا کہ بدی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ عقیدہ کہ "ہر انسانی بچہ گناہگار پیدا ہوتا ہے" اسی غلط تصور کی تخلیق ہے۔ دوسری طرف متفاول طبقہ (OPTIMIST) ہے جس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً نیک واقع ہوا ہے۔ یہ دونوں تصور باطل ہیں۔ انسان نہ فطرتاً نیک ہے نہ بد۔ اس میں کچھ صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں اور وہ بھی غیر نشوونمایافتہ (UN-DEVELOPED) شکل میں۔ یہ اس کے اختیار پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ (i) وہ ان صلاحیتوں کی نشوونما کرے یا انہیں ویسے ہی (UN-REALISED) چھوڑ دے۔ اور (ii) جب ان کی نشوونما کرے تو انہیں جس طریق پر چاہے استعمال کرے۔ اگر یہ انہیں نوعِ انسانی کے تعمیری مقاصد کے لئے صرف کرتا ہے، تو اسے نیکی کہا جائے گا۔ اگر انہیں تخریبی امور میں استعمال کرتا ہے تو یہ بدی کہلائے گی۔ وحی کی راہ نمائی سے ان صلاحیتوں کو نشوونما دینے کا طریق اور ان کا صحیح مصرف بتاتی ہے۔ یہ جو اوپر قرآن کریم کی بعض آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان ایسا ہے، اور ایسا ہے۔ تو اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر انسان وحی کی روشنی میں نہ چلے اور اپنے طبیعی تقاضوں کی تسکین ہی کو اپنا مقصودِ زندگی قرار دے لے تو پھر وہ اس قسم کا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی صلاحیتوں کو وحی کی راہ نمائی میں استعمال کرے تو پھر اس کی صفات وہ ہوں گی جنہیں قرآن "مومن کی زندگی" سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی ایسی زندگی جو خود اپنی اندرونی کشمکش سے بھی امن میں ہو اور جس سے پوری انسانیت امن میں رہے۔

اسے پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ "فطرت" اور "اختیار و ارادہ" دو متضاد چیزیں ہیں۔ فطرت، مجبوری کی ہوتی ہے۔ صاحبِ اختیار و ارادہ کی نہیں ہوتی۔ اور چونکہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کی فطرت کوئی نہیں ــ نہ نیک نہ بد۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

«انسان نے کیا سوچا؟» کا دوسرا حصہ

خُدا نے کیا کہا؟

یعنی وہ

جو خدا کی طرف سے نوعِ انسان کے لئے بطور نظامِ زندگی عطا ہوا تھا
اور جس سے کاروانِ انسانیت نے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا تھا

پرویز

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

یہاں حکیم الامت جیسے دیدہ ور کو بھی کہنا پڑا کہ

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبالؔ
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

لیکن ہمیں اُمید ہے کہ اگر ہم نے اس منزل میں قرآن جیسے خضرِ راہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، تو ہم چشمۂ حیواں تک بآسانی پہنچ جائیں گے کہ وَ الَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹)۔ اس کا ارشاد ہے۔

دُعا کا عام مفہوم

ہمارے ہاں دُعا کا عام مفہوم، خدا سے کچھ مانگنا لیا جاتا ہے۔ اس میں مانگنے کا تصور ایسا غالب اور عمیق ہوتا ہے کہ ہم "دُعا مانگنے" کے الفاظ بھی عام طور پر بولتے ہیں، حالانکہ اگر خود دعا سے مفہوم "مانگنا" لیا جائے تو "دعا مانگنا" کی ترکیب بے معنی اور بے ربط ہو جائے گی۔ عربی زبان میں دُعا کے معنی مانگنا نہیں، بلکہ کسی کو آواز دینا، بلانا، پکارنا ہیں۔ لیکن چونکہ عام طور پر کسی کو مدد کے لئے پکارا جاتا ہے، اس لئے اس کے معنی مدد مانگنے کے لئے جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک ہی لفظ ان لوگوں کے لئے بھی استعمال کرتا ہے جو حضرات انبیاءؑ کرام کے لائے ہوئے دینِ خالص کے نہیں، بلکہ اس کی محرّف شکل 'مذہب' کے پیرو ہوتے ہیں اور ان کے سلسلہ میں بھی جو دینِ خالص (قرآن) کے متبع ہوتے ہیں۔ جب وہ ایک لفظ کو اول الذکر کے سلسلہ میں استعمال کرتا ہے تو اس سے وہی مفہوم لیتا ہے جو ان کے ہاں مروّج ہوتا ہے اور جب اسی لفظ کو ثانی الذکر کے ضمن میں استعمال کرتا ہے تو اس سے صحیح قرآنی مفہوم لیتا ہے۔ مثلاً وہ اللہ کا لفظ دونوں کے لئے استعمال کرتا ہے لیکن مذہب پرستوں کے ہاں اس کا تصور کچھ اور ہوتا ہے اور دین کی رُو سے کچھ اور — یا جب وہ عبادت کا لفظ استعمال کرتا ہے، تو مذہب پرستوں کے ہاں اس سے مفہوم پرستش، پوجا پاٹ، (WORSHIP) ہوتا ہے لیکن دین کی رُو سے اس کے معنی احکام و قوانین خداوندی کی اطاعت ہوتا ہے۔ دین میں پرستش کا تصور نہیں بلکہ اطاعت اور محکومیت کا تصور ہوتا ہے اور اللہ سے مفہوم وہ بلند و بالا صاحبِ اقتدار ہستی، جس کے احکام و قوانین کی اطاعت کی جائے۔ اسی

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغِ بے نیام آیا
(اقبالؒ)

کتاب التقدیر

(دنیا کے مشکل ترین مسئلہ کا قابلِ فہم بصیرت افروز حل)

پرویزؔ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور ۵۴۶۶۰

ایک ہی پھول کی پنکھڑیاں ہیں۔ ایمان اس حقیقت کے اعتراف کا نام ہے کہ انسانی بسیرت کی بلندی کا راز، نظامِ عالم کے مرکزِ خیر و خوبی سے ہم آہنگی میں پوشیدہ ہے۔ دعا اس ہم آہنگی و یکرنگی کی شدید تڑپ ہے اور عمل اس تڑپ کا زندہ مظاہرہ اور اس کے حصول کے لئے کوشش پیہم۔ یہی ہیں مومنین کی وہ دعائیں جو مستجاب ہوتی ہیں۔ انہی کے ہاتھوں نظامِ خداوندی کا قیام عمل میں آتا ہے۔ ___ وہ نظام جس میں کسی کو اپنی انفرادی ضرورت اور حاجت کے لئے، راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دعائیں نہیں کرنی پڑتیں۔ یہ نظام "ان کی دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دیتا ہے۔" وہ اس کا انتظام کرتا ہے کہ ہر صاحبِ احتیاج کی دُعا (مانگ) بابِ خداوندی سے ٹکرانے سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔

باقی رہی ملائکہ کی تائید، سو اس کے لئے قرآن کریم نے واضح کر دیا ہے کہ لِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ (۸/۱۰)۔ اس سے انسان کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے جس سے اس کے قلب کو سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ (۸/۱۱)۔ اور اس سکونِ قلب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے قدموں میں ثبات و استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ ہے جو کچھ دُعا سے ہوتا ہے۔ یعنی اس سے انسان کے اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ کس قدر قابلِ صد رشک ہے وہ انداز جس میں اقبالؒ نے، اتنی بڑی رفیع و منیع اور عمیق و دقیق حقیقت کو دو مصرعوں میں واشگاف کر دیا ہے کہ جس سے بلیغ اور دلکش انداز، تصور میں نہیں آ سکتا۔ آپ بھی سنئے اور رقص کیجئے۔ کہا ہے کہ

تیری دُعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اس باب میں حرفِ آخر ہے۔ (قضا سے یہاں مراد قانونِ خداوندی ہے)۔

ایک دوسرے کیلئے دُعائیں کرنا

باقی رہا ہمارا ایک دوسرے کے لئے دُعا کرنا، تو یہ درحقیقت ان کے حق میں ہماری نیک آرزوؤں کا اظہار ہوتا ہے جس سے انہیں سکون حاصل ہوتا ہے۔ معاملات کی دنیا میں اسے اخلاقی تائید (MORAL SUPPORT) کہا جاتا ہے۔ اس سے خود اس شخص کے اندر ایک قسم کی نفسیاتی قوت بیدار ہو جاتی ہے جس کے اثرات نہایت خوشگوار ہوتے ہیں جس

غور کیجئے، مکہ کے مظلوم، خدا سے فریاد کرتے ہیں۔ خدا کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ براہِ راست ان کی امداد کر دیتا اور انہیں دشمنوں سے نجات دلا دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اُس مملکت، اُس حکومت، اُس نظام سے کہا جو اس کے نام پر، اُس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوا تھا کہ تم ان کی پکار کا جواب دو۔ تم ان کی مدد کے لئے اٹھو۔

مظلوموں کی دعائیں اسلامی مملکت سُنتی ہے

یہ ہے مظلوموں کی دعاؤں کے قبول ہونے کا صحیح طریقہ۔ یہی جماعتِ مومنین، جو اب مدینہ میں تھی، تیرہ برس تک، قریش کے بے پناہ مظالم کا تختۂ مشق بنی رہی۔ انہوں نے اس زمانے میں، خدا سے کچھ کم دعائیں تو نہیں مانگی ہوں گی! لیکن چونکہ اس وقت دنیا میں کوئی نظام ایسا نہیں تھا جو مظلوموں کی دادرسی کے لئے وجود میں آیا ہو، اس لئے ان کی مدد کا کوئی سامان نہ ہو سکا۔ ان سے کہا جاتا رہا کہ تم ہمت و استقلال سے کام لے کر اپنے پروگرام پر جمے رہو۔ ایک دن تمہاری حکومت قائم ہو جائے گی تو ان تمام مشکلات کا حل خود بخود مل جائے گا۔ اور اس طرح تمہاری اپنی مشکلات ہی حل نہیں ہو جائیں گی، تم ان مظلوموں کی امداد کے قابل بھی ہو جاؤ گے جو ہم سے (خدا سے) نصرت و اعانت کی دعائیں مانگیں گے۔ دیکھئے، اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کس بلیغ انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا۔ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ۔ کہو! کہ وہ کون ہے جو قلبِ مضطر کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو دُور کر دیتا ہے! وہ اس کے لئے کیا کرتا ہے وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ (۲۷/۶۲)۔ وہ تمہیں حکومت و مملکت عطا کر دیتا ہے۔ یہ ہے طریقِ خداوندی جس سے مظلوموں کی مصیبتیں رفع ہوتی ہیں۔ (واضح رہے کہ یہ حکومت بھی محض دعائیں مانگنے سے عطا نہیں ہو جاتی۔ یہ ان کے ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ ہوتی ہے ۲۴/۵۵)۔

دوسرے مقام پر اسی جماعتِ مومنین کے متعلق کہا ہے۔ وَ الَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ ۪ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۚ (۴۲/۳۸)۔ " یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس کے احکام و قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں۔ انہی کی روشنی میں، اپنے امورِ مملکت باہمی مشورہ